

## Apnon Ne Mar Dala اپنوں نے مار ڈالا

[وقت کا دھارا بہتا چلا جاتا ہے سال گذرتے ہیں ،موسم بدلتے ہیں لیکن ہمارے دلوں کے موسم کبھی کبھار ٹھہر سے جاتے ہیں۔ میری زندگی بھی ایک مسلسل مشقت کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی میں جتنی محنت اور کوشش سے رشتے سمیٹے سب میرے ہاتھوں سے ریت کی پٹی کی مانند رستے چلے گئے۔ میری زندگی کی کہانی بھی عجیب سی ہے۔ کیا ایسی کسی اور پر بیٹی ہو گی؟ پہلے جب زخم برے تھے ، لکھ بھی نہ سکتی تھی۔ اب کچھ نہ کچھ لکھنے لائق ہو گئی ہوں۔ مجھے لکھنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ اسپتال میں آپ اپنے روز و شب کے بارے میں تحریر کرنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ تو ہی ایک ڈائری منگوا کر میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے جب ڈائری لکھنے کی ابتدا کی تو کورے صفحات پر چند سطروں میں گزرے وقت کا حال لکھ دیا اور عنوان لکھا 'اسپتال کا ایک دن۔ جیسے ہی ڈاکٹر روارڈ کا آخری راونڈ ختم کر کے چلے جاتے ہیں ، مکمل خاموشی ہو جاتی ہے ،تب میں چھت سے آتی مدھم روشنی میں قلم اور ڈائری اٹھا کر پلنگ کے سرہانے ٹیک لگا کر لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔ بستر پر اس طرح بیٹھ کر لکھنا، بے تو دقت طلب مگر بیماری کا کچھ ادھار ہو جاتا ہے۔ جب مریضوں کے لواحقین اور چاہنے والے والہانہ انداز سے آتے ہیں ،اس وقت میری جلتی ہوئی آنکھیں دروازے پر جم جاتی ہیں کہ شاید میرا جیون ساتھی مجھ سے ملنے آجائے، جس کا بھی دعویٰ تھا کہ وہ میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر جب برے دن آئے ، اس نے میری بیماری سے ڈر کر مجھے بھلا ہی دیا۔ ہاں ایک میری ماں اپنے نحیف جسم کو کھینچتے ہوئے ملنے آجاتی ہیں ، ان سے ہی دو چار باتیں ہو جاتی ہیں ورنہ میں خاموش لیٹی رہتی ہوں اور صحت یاب ہونے والے مریضوں کے رشتے داروں کی باتیں سنتی رہتی ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں نے میٹرک پاس کیا اور ہنستی مسکراتی جوانی کی حدود میں قدم رکھا، اس زمانے میں میری رنگت سفید گلابی اور آنکھیں شرابی ہو کر تھیں، جن کی سپیلیاں تشبیہ سوچا کرتی تھیں۔ اس خوشیوں اور بے فکری سے بھر پور دور میں مجھے کسی کی نظر لگ گئی اور اچانک کسی بیماری کا حملہ ہوا جو شروع میں بالکل معمولی نوعیت کا تھا مگر بعد میں کس مشکل سے گزری، لکھ نہ پاؤں گی۔ بات تو درسی لکھی تھی کہ میری ایک انگلی پر چھوٹا سا دانہ نکلا تھا جو معمولی نوعیت کا تھا مگر یہ رفتہ رفتہ زخم بن کر مجھے دنوں تکلیف پہنچاتا رہا۔ میں نے عام دانہ سمجھ کر اس پر کوئی توجہ نہ دی کہ آخر یہ زخم خود بخود بھر گیا۔ اسی دوران خالو xa0\جان اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے میرا رشتہ مانگنے آگئے اور والدین نے سراج xa0\کے لئے ہاں کہہ دی۔ ان دنوں میرے دل میں اچھوتے جذبات تھے ، میں نے گھریلو کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ خانہ داری سیکھی کہ اپنی آئندہ زندگی کو کامیاب اور شاندار بنانے کے خواب دیکھ رہی تھی ، اپنے سینوں کے محل سجاری تھی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ وارڈ میں سیبی مریض سو چکے ہیں لیکن میں اس وقت اپنی زخمی انگلیوں سے بے دقت تمام اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہی ہوں۔ شاید اس طرح میرے دکھ کا مداوا ہو جائے کہ جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ مجھے آج فضا میں حد سے زیادہ بے چینی کھلی محسوس ہو رہی ہے میرے اس پاس اس وقت کوئی شے خوش آئند اور پرکشش نہیں ہے ، صرف ان پھولوں کے سوا جو مجھے ایک مایوس مریضہ سمجھ کر کوئی تحفہ دے گیا۔ مجھے وہ دن شدت سے یاد آ رہے ہیں جب میری شادی کی تیاریوں میں گھر بھر مصروف نظر آتا تھا اور چھوٹا بھائی جدائی کے خیال سے افسردہ ہو کر مجھ سے پار بار لیٹ جاتا تھا تو میں اس کو گلے سے لگا کر رو پڑتی تھی۔ دن پر لگا کر اڑ گئے لیکن آج بھی میرے کانوں میں کبھی کبھی شہنائی کی آواز اور سہاگ کے گیت گونجتے ہیں۔ ہم سفر کے ہمراہ سیج کے خوشبودار پھولوں کے سائے میں میں نے ایک دل نشین سفر کے خواب سجائے تھے۔ مجھے اپنا وہ چھوٹا سا خوبصورت گھر یاد آتا ہے جس کی دیواروں پر پھولوں سے لدی بلبیں آرام کرتی تھیں۔ میرے جیون ساتھی سراج xa0\کو میرے ہاتھ کے پکوان پسند تھے۔ وہ ہر وقت سب کے سامنے میری تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ پر پیڑ گار خالو xa0\بھی میرے مشرقی اطوار سے بہت خوش تھے۔ ہمارا گھر تو جنت نظیر تھالیکن تقدیر کے ناگ نے بہت جلد میری خوشیوں کو ڈس لیا۔ اور یہ زہر آہستہ آہستہ میری زندگی میں سرایت کر نے لگا۔ شادی کے بعد میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرے جسم کے اندر کوئی بیماری جڑ میں مضبوط کر رہی ہے۔ اس دوران مجھ پر اس بیماری کا کوئی حملہ بھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دانتیں ہاتھ پر صرف ایک دیرینہ زخم کا نشان تھا جس کو میں نے اپنے ان مسکراتے دنوں میں کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب پھر سے میری سفید مخروطی انگلیوں کے جوڑوں پر زخم بننے لگے اور آخر یہ زخم گھریلو ذمہ داریوں میں مغل ہونے لگے۔ ان زخموں کی وجہ سے میں اپنے شوہر کو وقت پر کھانا نہ دے سکتی تھی ، کبھی ان کے کپڑے دھو کر استری کرنے میں تاخیر ہو جاتی۔ وہ میری بیماری کے متعلق جاننے تھے لیکن اپنی کار و باری مصروفیات کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا سکتے تھے۔ میں بھی اصرار نہیں کرتی تھی۔ البتہ خود علاج کراتی رہی۔ چھپ کر پیروں فقیروں کے پاس جاتی ، سوچتی کہ کہیں ایسا نہ ہو میرے ہاتھوں کے یہ زخم دل کے زخم بن جائیں۔ وقت گزرتا گیا لیکن زخم نہ بھرے۔ ان کو دیکھ کر خالو xa0\جان مصلحت زبان سے کچھ نہ کہتے لیکن ان کی نگاہوں سے ٹپکنی کرابت میری روح کو زخمی کر دیتی تھی۔ یہ وہی خالو xa0\جان تھے جو میرے کھانوں کی بے حد تعریف کرتے تھے ، اب نقص نکال کر اٹھ جاتے تھے۔ انہی دنوں مجھ پر بیماری کا پھر حملہ ہوا۔ شروع میں معمولی نوعیت تھی مگر انجام کار سراج xa0\بھی مجھ سے دور رہنے لگے۔ ان کی چابٹ کار نگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ خواب جو میں نے زندگی کے دلنشین سفر کے بارے میں سجائے تھے۔ بکھرنے لگے۔ گھر کاماحول گھٹن آمیز ہوتا جاتا تھا۔ دیواروں سے لپٹی پھولوں کی بلبیں ہر پنہ ہو چکی تھی۔ دھوپ اتر آتی تھی کہ ان پر خزاں چار ہی تھی۔ اس کے بعد کے دنوں میں مایوسی در آنے لگی۔ یوں معلوم ہوتا کہ میری دعائیں بے اثر ہوتی جاتی ہیں مگر قبولیت کے در کھلنے کی میں منتظر تھی۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں بھی گزرا کر لیتی لیکن سراج xa0\جیسے نفاس پسند شوہر کو زخمی انگلیوں والی عورت کے ساتھ زندگی گزارنا پسند نہ تھا۔ میرے خیال میں ایک عورت تو اپنی خوشیاں قربان کر کے معذور شخص کے ساتھ رہ سکتی ہے لیکن ایک مرد بیمار اور انگشت فگار بیوی کی وفا کے بدلے اپنے عیش و آرام کو قربان نہیں کر سکتا۔ اب یہ ہونے لگا کہ میں اگر ان کی کسی چیز کو چھو لیتی تو وہ آنکھ بچا کر اسے کیاڑ خانے میں پھینک آتے اور میں خاموشی سے اس تحقیر کو سہنے پر مجبور تھی۔ میں تنہائی میں رورو کر خدا سے دعا مانگی۔... اللہ میرے ہاتھوں کے زخموں کو ٹھیک کر دے تا کہ میری ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے مگر یہ دعا خدا کی بارگاہ میں باریاب نہ ہو سکی۔ آخر کار سراج xa0\نے میری بیماری کو لا علاج سمجھ کر پہلے کنارہ کیا اور پھر طلاق دے دی۔ میں مجبور و بے بس اسی دیلیز پر لوٹ آئی جہاں سے میری ٹولی نکلی تھی۔ جنہوں نے جنم دیا تھا، انہوں نے پھر سے گلے لگالیا۔ ماں نے مجھے ایسے اپنی ہاتھوں میں بھر لیا جیسے میں ننھی بچی ہوں۔ والد

ضرورت نہیں۔ ابو نے مجھ صاحب نے بھی سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ بیٹی جب تک زندہ ہوں ، تجھ کو ملال کرنے کی کو لخت جگر جانا، سراج (xaxa) کی طرح امر بیل نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ بھی میرا محافظ تھا اور ابو بھی لیکن شوہر اور باپ کی محبت میں فرق ہو تا ہے ۔ ماں باپ اولاد کے لئے مال و زر تو کیا، جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ علاج کے لئے ابو مجھے لے کر نگر نگر گھومتے رہے ۔ پیر فقیر ، طبیب، سنیا سی ، ڈاکٹر ، حکیم، غرض کس کے پاس لے کر نہیں گئے۔ کچھ عرصہ کسی دوا سے آفاقہ ہوا بھی تو ہفتہ بعد بیماری پھر سے عود کر آئی۔ کئی بار پرائیویٹ ڈاکٹروں کے کلینک میں بھی زیر علاج رہی۔ آفاقہ عارضی ہوتا، پھر سے سوکھے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ آخر کار وقت نے مجھے سول اسپتال پہنچا دیا۔ یہاں کے ڈاکٹر قابل تھے۔ وہ میری بیماری سے مایوس نہیں تھے۔ وہ مجھے لا علاج نہیں کہتے تھے۔ خدا جانے کیسی بیماری تھی ، دوا اثر کرتی تھی لیکن مستقل شفا یابی نہ ہوتی تھی۔ اسپتال کے بستر پر میں اچھے ہونے کے انتظار میں لمحہ لمحہ مرتی رہی۔ یہاں اسپتال کا ماحول ایسا تھا کہ رات گئے سناتا ہو جاتا تھا۔ سب سو جاتے ، اک مجھے نیند نہ آتی ، نیند کس طرح آسکتی تھی ، زخمی بدن پر ماضی کی تلخ یادوں کے ناگ بھی تو پہن پھیلائے بیٹھے تھے۔ سوچنے سوچنے رات گزر جاتی کہ خدا تو اپنے بندوں پر مہربان ہے ، پھر میری تقدیر میں اتنی مختصر خوشیاں کیوں لکھی گئیں؟ باباجان کے گھر میں اکثر خاموش رہتی تھی۔ ان پر یہ ظاہر نہ کرتی کہ اپنوں کے خنجر سے اپنی روح کو زخمی ہو تا دیکھ کر میری کتنی راتیں آنسو بہانے اور خدا سے فریاد کرتے گزرتی ہیں۔ مجھے اپنے والدین سے بہت پیار تھا، ان کو بالکل بھی دکھی نہ کر نا چاہتی تھی۔ آخر تک بابا جان مایوس نہ تھے۔ وہ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کے لئے رجوع کرتے رہتے تھے۔ شاید ان کا خیال ہو گا کہ میں ایک بار مکمل شفایاب ہو جاؤں تو وہ پھر سے میرا گھر بسانے کا اہتمام کر دیں۔ جن دنوں سراج (xaxa) نے مجھے طلاق دی، میرے اندر ایک نئی زندگی نمودار ہوئی تھی۔ میں اب یہی سوچ سوچ تھک جاتی تھی کہ اس نئی زندگی کی پرورش اور مستقبل کا کیا ہو گا۔ ان دنوں میرے پاس ماضی کے تلخ تجربے تھے مگر کوئی امید کی کرن نہ تھی ، اگر امید کی کرن تھی تو میرے لئے آنے والی اولاد تھی جس کے لئے ارادے باندھنی تھی۔ کیسے اپنے بچے کو اپنے ہاتھوں سے پروان چڑھاؤں گی ۔ او! یہ ارادے میری بد نصیبی کے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ میرے ایک بچی ہوئی لیکن وہ بھی میرے مرض کی زد سے نہ بچ سکی اور اپنے خالق کے پاس پہنچ گئی۔ امید کے اس چراغ کے بجھنے ہی میرے دن رات ہمیشہ کے لئے ویران ہو گئے۔ اب زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ بے در پے محرمیوں کے بعد اپنی خود اعتمادی کے بل بوتے پر میں اباجان کے گھر خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ زخمی انگلیوں کے باوجود امی کا ہاتھ پٹانے کی کوشش کرتی۔ اگر زخم بدلتے موسم کے ساتھ خشک ہو جاتے تو باباجان کی پسند کا کھانا بناتی ، بھیا کا کوئی کام ہوتا تو کر دیتی۔ یہ سب لوگ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوشش کرتے تھے کسی طرح بھی میری دلآزاری نہ ہو ۔ کچھ عرصہ یو نہی بیت گیا۔ میں بظاہر پر سکون تھی لیکن اکثر راتیں حال اور مستقبل کی تکلیف دہ سوچوں سے آنسو بہاتے گزرتی تھیں۔ میری صحت یابی کے لئے امی جان و وظائف کا ورد کرتی رہتی تھیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ میری بیماری بڑھتی جاتی تھی۔ زخموں نے ہاتھوں کے بعد کف پا میں بھی جگہ بنالی۔ وہ چال جس کو کبھی سہیلیاں ہر نی کی فلاںچیں کہتی تھیں ، اب قدم پھونک پھونک کر بھی زمین پر رکھتی تو بھی تکلیف ہوتی، ہر قدم پرائیس اٹھتی۔ میرا رنگ بیماری سے سیاہ ہو تا جا رہا تھا اور سنہرے بال جڑ چھوڑتے جاتے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ عرصے بعد کوئی مجھ دیکھ کر پہچان ہی نہ پاتا تھا کہ میں وہی گل ناز ہوں۔ ماں باپ کے زیر سایہ اس گلشن شفقت میں جیسے تیسے خزاں کا جھوٹا بن کر گزار ہ ہو رہا تھا۔ دل اور جسم ضرور جلتے رہتے تھے۔ لیکن بابا جان اور امی جان کی محبت ٹھنڈی چھاؤں نے مجھے خاکستر ہونے سے بچائے رکھا۔ بھائی کی شادی ہو گئی ، تب اس خاتون کی نگاہوں نے مجھے شدت سے احساس دلایا کہ میری انگلیوں کے زخم سے ان کو کس قدر کراہت آتی ہے۔ بھابی کے تحقیرانہ جملے میری روح کو آبلہ دار بناتے جاتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے بھی میری زندگی اگرچہ بے مقصد تھی مگر میں نے اپنی زندگی ماں باپ اور گھریلو مصروفیات کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ صرف میری قوت ارادی اور والدین کی محبت کا کرشمہ تھا جس نے مجھے اس حال میں بھی طاقت بخشی ہوئی تھی۔ اب گھر میں ایک ہی فردا دایسا تھا جس کی چھٹی نگاہیں مجھے جینے نہیں دیتی تھیں ، اور یہ بھابھی تھی جو میرے ہاتھوں ہی سے نہیں میرے تمام وجود سے کراہت محسوس کرتی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھنے سے ، مجھ سے کلام تک کرنے سے ڈرتی تھی۔ میں جس شے کو چھو لیتی ، وہ اس سے دور بھاگ جاتی۔ می دن بہت کٹھن تھے۔ میں اپنے والدین کے گھر میں بھی اچھوت ہو گئی تھی۔ بابا جان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ میں اپنی بیماری کے باوجود ان کی خدمت کرتی۔ بالآخر بابا جان کا سانبان بھی جاتا رہا۔ ان کی وفات کے بعد تو مجھے لگا جیسے دو پہر کی تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں نکل آئی ہوں۔ بابا جان کی وفات کے بعد امی کی بجائے بھابی کی گھر پر حکمرانی ہو گئی۔ حالات کی حدت بڑھنے لگی۔ گھریلو کام کاج سے میرا واسطہ مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ اب مجھے اپنے کمرے سے باہر آنے کا حکم نہ تھا ، آج بھی مجھے وہ تپتے دن ، جلتی را تیں یاد ہیں جب میں تنہا اپنے کمرے میں محدود کر دی گئی تھی اور ملازم مجھے دور سے کھانا دے دیا کرتے تھے ۔ امی جان بھیچھپ کر میرے کمرے میں آتی تھیں کیونکہ دلہن بھابی ماہم کا خیال تھا کہ امی جان کی وجہ سے میری بیماری کے جراثیم گھر کے دوسرے افراد میں منتقل ہو جائیں گے۔ رفتہ رفتہ بیماری اس نہج پر پہنچی کہ اعصاب جواب دے گئے۔ جسم کے عضلات سکڑنے لگے۔ اس تنہائی اور اندھیرے میں روح کے تمام زخم بھی رسنے لگے۔ بھابی کو میرا زخم زخم وجود اب گھر میں بوجہ نظر آنے لگا۔ کیونکہ سب کو یقین تھا یہ زخم اب جسم پر بھی ابھریں گے ۔ یوں مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے اس دلائی کہ اس بیماری سے شفا ہو گی ، وہ ضرور علاج کریں گے۔ یہاں کا ماحول گھر کے ماحول سے مختلف تھا۔ یہاں مریض یا ان کے رشتے دار میرے زخموں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے تھے اور میری نامراد جوانی پر افسوس کرتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ غیر تو ہمدردی کے دو بول بول جاتے مگر بھائی اور رشتے دار الفاظ کے نشتر چلاتے ، پھر تو غیر بھلے تھے جو دکھتے دل پر تسلی کے جملوں سے ٹھنڈی شبیم تو ہر سا جاتے تھے۔ ایک امی تھیں کہ راتوں کو آٹھ آٹھ گھنٹے میری صحت یابی کی دعا کرتی تھیں۔ حالانکہ اب تو میں اس زخم زخم زندگی کی خو گر ہو چکی تھی۔ اک وہ مایوس نہ تھیں خدا کی رحمتوں سے اور اک وہ ڈاکٹر صاحب – بالآخر ماں کی دعائیں اور ڈاکٹر صاحب کی محنت رنگ لائی اور میری انگلیوں کے زخم بہتری کی طرف جانے لگے ۔ رفتہ رفتہ میں روبہ صحت ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے مزید چھ ماہ اور میرا علاج ہو گا تو مکمل صحت یابی مجھے نصیب ہو جائے گی۔ تبھی میں بھی اس امید پر اور زندگی جی رہی ہوں۔

